Tauseeq, Volume. 2, Issue. 1
ISSN (P) 2790-9271 (E) 2790-928X
DOI: https://doi.org/10.37605/tauseeq.v2i1.18

Received: 23-03-2021
Accepted: 26-03-2021
Published: 30-06-2021

اقبال اور فکرِ یونانی

(Iqbal and Greek Philosophy)

ڈاکٹر واجد علی شاہ*

ڈاکٹر شہلا داؤد**

Abstract

The superiority and honor was granted to the human being due to knowledge and intellect. The branches of knowledge include logic, philosophy, rationale and scholasticism. In the field of philosophy the Greek remained on high rank. It can be said that all the successive philosophers followed Greek philosophy.

Socrates laid the foundation of Greek philosophy, after him his pupil Plato not only compiled his works of his teacher but also amended some fine new things and on some places he contradicted with his teacher. Aristotle the pupil of Plato raised the Greek philosophy to the climax. The great Muslim philosopher of the current era Allama Muhammad Iqbal also served a lot in the field of philosophy.

In this research article the thoughts of Iqbal are analyzed as to what extent he derived his thoughts from Greek philosophy and which points he differed with it.

Key words: Iqbal Greek philosophy, Amended, Climax

تعارف:

تاریخ میں بعض ایسی قد آور شخصیات گزری ہیں جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر ایسے کارہائے نمایاں سر انجام دیے ہیں کہ اپنے آپ کو تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ اُن شخصیات میں ایک بڑی شخصیت، آسمانِ فلسفہ پر چمکتے

*۔ اسسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف صوابی

**۔ اسسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف پشاور

سورج سقراط ہیں۔ سقراط ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے فلسفے اور خیالات سے تقریباً سبھی فلاسفہ نے اتفاق کیا ہے۔ اِس یونانی فلسفی نے تقریباً پانچ سو قبلِ مسیح مغربی فلسفے کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد اس کے شاگرد رشید افلاطون نے اس میں کافی مثبت اور نئے اضافے کیے اور سقراط کے فلسفے کی تدوین و تجدید کی۔ اس کے افلاطون کے شاگرد ارسطو نے اس بہت بلندی پر پہنچا دیا۔ عظیم مسلمان شاعر و فلسفی علامہ محمد اقبال کا شمار بیسویں صدی کے عظیم فلاسفہ میں ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کی فکری اڑان میں جن افکار نے اہم کردار ادا کیا ہے، ان میں یونانی فلسفہ کا بھی اہم کردار ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں علامہ اقبال پر یونانی فلسفے کے اثرات کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

سقراط کی کوئی باقاعدہ تحریر تو ہے ہی نہیں البتہ اُن کے خیالات و افکار اور فلسفہ کو اُن کے شاگرد افلاطون اور ذنوفن وغیرہ نے محفوظ کیا اور ساتھ ہی اُن کا فلسفہ اور حالاتِ زندگی بھی بیان کیے ہیں۔ سقراط ایک مجسمہ ساز کے بیٹے تھے اِس لیے مجسمہ سازی کرنے لگے۔ پھر اوائل حیات میں ملکی فوج کا حصہ بنے اور حب الوطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کئی جنگوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ فوج سے فراغت کے بعد وہ خلوت نشینی کرنے لگے۔ اِسی تنہائی میں اُن پر علم و حکمت کے در وا ہوئے۔ اُن کے خیالات میں جو سب سے بڑا انقلاب برپا ہوا وہ نظام میں توحیدی فکر کا پیدا ہونا تھا۔ اگر اُن کے خیالات کا جائزہ لیا جائے تو اُن کے افکار دینِ اسلام سے بڑی حد تک ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض محققین حضرات سقراط کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اور لقمانِ حکیم ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ لیکن یہ اُن محققین کی اپنی سوچ ہے چونکہ تاریخی طور پر اِس کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

اس عظیم فلسفی نے جہاں دُنیا کے بڑے بڑے اہلِ علم و فن کو متاثر کیا وہاں اقبال جیسے نابغہ روزگار شاعر و فلسفی کا متاثر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگلے سطور میں ہم سقراط کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کریں گے اور کلامِ اقبال سے اُن کی توثیق کریں گے کہ اقبال کا سقراط سے متاثر ہونا یقینی ہے۔ سقراط روح کے متعلق کہتے ہیں کہ روح ایک مجرد اور تنہا حقیقت ہے اور موت کے آنے سے روح جسم سے الگ ہو جاتی ہے۔ اُسے قفسِ عنصری سے گلو خلاصی مل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موت سے ڈرنا ایک احمقانہ اور بزدلانہ فعل ہے۔ جب ہم اقبال کی تعلیمات کا جائزہ لیتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔

؎ موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی(1)

سقراط، انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد کے مقابلے میں ترجیح دینے والوں کو جاہل کہتے ہیں۔ کیونکہ اُس شخص میں وسعتِ نظر اور دور اندیشی کا فقدان ہوتا ہے۔ اقبال کے کلام میں بھی اِسی اجتماعیت کا درس ملتا ہے۔ اگر ہم مغربی نظامِ فکر کا جائزہ لیں تو

وہاں یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ بہت معمولی مفادات کی خاطر وہ کس طرح انسانوں کا خون بہانے سے نہیں چوکتے۔ اقبال ایک طرف اخوتِ اسلامی کی بات کرتا ہے تو ساتھ ساتھ جمیعتِ آدم کی طرف نوعِ بشری کو دعوت دیتا ہے۔

اخوت اس کو کہتے ہیں چبھے کانٹا جو کابل میں
تو ہندوستاں کا ہر پیر و جواں بیدار ہو جائے

سقراط معاشرے کو امن و محبت کا گہوارہ بنانے کے لیے ظلم و ناانصافی، عدل و انصاف اور باطل و سچائی میں امتیاز روا رکھنا چاہتا ہے۔ سقراط کی خودداری، حق گوئی اور خدا پرستی کے جذبے سے اقبال متاثر ہوئے۔ افلاطون کی کتاب مکالماتِ افلاطون سے سقراط کا ایک زبردست اور دلیرانہ کلام یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"اے اہلِ ایتھنس! میں تمہاری عزت اور تم سے بہت محبت کرتا ہوں لیکن میں تمہارے مقابلے میں خدا کے حکم کی تعمیل کروں گا اور جب تک میری جان میں جان اور بدن میں طاقت ہے، اس فلسفے پر عمل کرنا اور اس کی تعمیل دینا نہیں چھوڑوں گا بلکہ جس سے ملوں گا اس سے اپنے انداز میں یہی کہوں گا۔ اے میرے دوست! جو اس عظیم الشان اور حکمت نشان شہر ایتھنس کے رہنے والے ہو تم کو شرم نہیں آئی کہ تم اس قدر دولت و شہرت اور عزت حاصل کر رہے ہو مگر تمہیں حکمت اور حق کی مطلق فکر نہیں اور روحانی ترقی کا ذرا بھی خیال نہیں۔ اگر میں نے دیکھا کہ اس میں ذرا بھی نیکی نہیں بلکہ زبانی دعوے کرتا ہے تو اس کو بُرا کہتا ہوں کہ وہ بڑی چیز کی کم اور چھوٹی چیز کی زیادہ قدر کرتا ہے۔ اور جو کوئی مجھ سے ملے گا اس کے سامنے میں یہی الفاظ دہراؤں گا خواہ وہ جواں ہو یا بوڑھا، شہر کا ہو یا باہر، خصوصاً اپنے شہر والوں سے اس لیے کہ میرے بھائی ہیں۔ کیونکہ تم یہ جان لو کہ یہ خدا کا حکم ہے اور میرے خیال میں میں نے خدا کی جو خدمت کی ہے اس سے زیادہ مفید کوئی چیز ریاست کے لیے نہیں ہے۔ میرا تو بس یہی کام ہے کہ میں تم سب کو خواہ جوان ہو یا بوڑھا، اس پر آمادہ کروں کہ تم اپنے جان و مال کی پرواہ نہ کرو بلکہ اپنی روحانی ترقی کو اس سے زیادہ مقدم سمجھو۔ نیکی روپیہ سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ نیکی سے روپیہ اور ہر وہ چیز جو انسان کے لیے اچھی ہے خواہ وہ ذاتی ہو یا عمومی، حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہے میری تعلیم۔"(2)

یہی تعلیمات قرآنی تعلیمات سے ترادف رکھتے ہیں اور ڈاکٹر اقبال کے کلام میں یہی سبق واضح طور پر موجود ہے۔ سب سے بڑھ کر مماثلت جو سقراط اور کلامِ اقبال کے مابین دیکھا جا سکتا ہے، وہ مؤحدانہ سوچ ہے۔ سقراط کے توحیدی افکار دینِ ابراہیمی سے مکمل طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ اقبال نے اپنے کلام میں توحیدی فکر توسع کے ساتھ بیان کی ہے اُس کی مثال ملنی بہت مشکل ہے۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لآ اِلٰہ میں ہے(3)

اسی توحیدی سوچ کا ماحصل خودی کی مضبوطی ہے ، اور خودی کے نتیجے میں انسانِ کامل کا ظہور ہوتا ہے ، جو ہر قسم کے خوف وخطر سے مبرا ہوتا ہے۔ یہی وہ پسندیدہ شخصیت ہوتی ہے جو تمام مفکرین چاہتے ہیں لیکن حقیقت کا راستہ بتانے والا کوئی نہیں ۔ ہر کوئی اختراع کرتا رہا۔ ڈاکٹر اقبال کو وحی الٰہی کے اندر یہ رستہ نظر آیا چنانچہ اپنے الہامی کلام میں ان کو بڑی مہارت سے ڈھالا۔ سقراط کے ہاں دیکھا جائے تو اُن کی تعلیمات بھی انبیاء کرام اور دینِ اسلام سے بے حد قریب ہیں، خصوصاً جسم، روح اور موت کے حوالے سے ۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق موت ایک ایسی شے نہیں جو نیست ونابود کرنے والی ہو بلکہ یہ تو انتقال ہے ایک مکان سے دوسرے مکان کی جانب، ایک جہاں سے دوسرے جہاں چلے جانا۔ قرآن کریم موت کے لیے خاص لفظ "توفی" استعمال کرتا ہے جس کے معنی قبضہ میں لے لینا۔ مطلب یہ ہوا کہ بوقتِ مرگ ایک انسان اللہ کے سامنے اپنی شخصیت اور اپنی حقیقت کے ساتھ حاضر ہو جاتا ہے۔ اقبال اور قرآن کو ہم الگ الگ نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ اقبال کے سامنے قرآن کی جو بھی تعلیم درپیش ہوئی اُس کے سامنے وہ سر تسلیم خم کر گئے۔

علامہ مرحوم کے کلام اور اُن کے افکار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ علامہ بھی انہی تعلیمات کی تشہیر و تبلیغ کر رہے ہیں۔ عشق کے حوالے سے سقراط کا نقطہ نظر علامہ مرحوم سے کسی قدر مختلف نظر آتا ہے، لیکن یہ اختلاف بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے ۔ عرق ریزی اور ایک خاص نظر سے غور کرنے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سقراط جس عشق کی مخالفت کرتے ہیں کہ یہ ناکامی کی طرف لے جانے والی ہے۔ یہ خود غرضانہ اور محض عشقِ مجازی کے حوالے سے بات کی ہے۔ اقبال جس عشق کے طرف دار ہیں وہ محض عشق بازی نہیں بلکہ مقاصدِ اعلیٰ کے حصول کے لیے ہر خوف وخطر اور لالچ سے بالاتر ہو کر جدو جہد اور کوشش کرنا ہے۔ سقراط نے جس عشق سے کراہت کا اظہار کیا ہے، اس پر غور کرے تو لامحالہ دل و دماغ اس میں فیصلہ کر دیتا ہے کہ اقبال جیسی شخصیت بھی یقیناً اس میں یہی کرتے۔ ایک مکالمے میں سقراط، فیڈرس سے عشق کے متعلق اپنے افکار یوں بیان کرتا ہے۔

"میرا یہ دعویٰ ہے کہ مجھے اپنے مقصد میں اس وجہ سے ناکامیابی نہیں ہونی چاہیے کہ میں تمہارا عاشق نہیں ہوں۔ عاشق تو جب ان کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے، اُن خدمتوں پر جو اُنھوں نے اپنے محبوب کے لیے کی ہیں،

پچھتاتے ہیں مگر غیر عاشق، جو اپنی مرضی کے مالک ہیں اور کسی چیز سے مجبور نہیں کبھی نہیں پچھتاتے اس لیے کہ وہ اتنا ہی سلوک کرتے ہیں جتنا اُن کے مقدور میں ہے۔ اور جتنا خود اُن کے مقصد کے لیے مفید ہے۔ پھر یہ کہ عاشق سوچتے ہیں کہ اُنھوں نے محبت کی خاطر اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کی خدمت کی اور جب اُس کے ساتھ وہ اُن تکلیفوں کا حساب لگاتے ہیں جو انھوں نے اُٹھائی ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے محبوب کے احسانوں کی بخوبی تلافی کر دی، مگر غیر عاشق کے دل میں کبھی ایسے تکلیف دہ خیالات نہیں آتے۔ اُس نے نہ تو کبھی محبت کی خاطر اپنا کام چھوڑا اور نہ اپنے عزیزوں سے بگاڑی۔ اُسے نہ تو اپنی تکلیفیں شمار کرنی ہیں اور نہ بہانے بنانے ہیں۔ جب اُن میں سے کوئی بات نہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ بغیر کسی تکلیف کے وہ کام نہ کرے جس میں محبوب کی خوشی ہو۔۔۔ جب ہمارا خیال عقل کی مدد سے نیکی کے بلند ترین درجے پر پہنچا دیتا ہے تو جوہر غالب عفت کہلاتا ہے، لیکن جب خواہش، جو عقل سے خالی ہوتی ہے، ہم پر غالب آجاتی ہے اور ہمیں راحت و عیش میں ڈال دیتی ہے، تو یہ بدنظمی کی قوت اعتدال کہلاتی ہے۔"(4)

مندرجہ بالا عبارت میں عشق کے حوالے سے جو نقطہ نظر سقراط نے بیان کیا ہے جو ظاہر ہے ہوس پرستی کہلائے جانے کے قابل ہے نہ کہ عشق۔ وہ جذبہ عشق جو کارہائے نمایاں کے لیے ناگزیر ہے، اس کی حمایت تو سقراط کے الفاظ میں نمایاں ہے، کہ وہ حق گوئی چھوڑنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں ہے۔

علامہ محمد اقبال نے فلسفہ خودی اور معرفت نفس و معرفتِ حق کی دعوت دی ہے۔ یہی شے ہمیں سقراط کے ہاں ملتی ہے۔ ول ڈیورنیٹ اپنی کتب میں سقراط کا نظریہ خودی یوں بیان کرتا ہے:

"انسان کے شکوک کے ساتھ ہی فلسفہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ بالخصوص جب انسان کو اپنے عزیز یقینات ،معتقدات اور بدیہات کے متعلق بھی شک گزرنے لگے۔ کون کہ سکتا ہے کہ ان یقینات نے مسلمات کی صورت کس طرح اختیار کی۔ کیا ایسا تو نہیں کہ کسی تمنائے مخفی نے آرزو کو فکر کا لباس پہنا کر چپکے چپکے انہیں پیدا کر دیا ہو، اصل فلسفہ تبھی شروع ہوتا ہے کہ ذہن انسانی مڑ کر اپنی طرف دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو پرکھتا ہے۔ سقراط کہتا تھا۔ "اپنے آپ کو پہچانو" یہ جستجو بہت خوب ہے لیکن ان تمام اشجار، احجار اور ثوابت و سیار سے کہیں زیادہ گراں یہ موضوع موجود ہے۔ یہ انسان کا ذہن ہے۔ انسان کیا ہے اور وہ کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔" چنانچہ اس کا شغل یہی تھا کہ روحِ انسانی میں جھانک کر دیکھے۔۔ مفروضات کو بے نقاب کرے اور مسلمات کو معرضِ بحث میں لائے۔" (5)

سقراط اور اقبال کے ہاں ایک اور مماثلت یہ ہے کہ دونوں حضرات مادیت کے مقابلے میں روحانیت کو اہم سمجھتے ہیں۔اور اُس کی منطقی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ بدن، جسم موت کے بعد کہیں اور نہیں جاتی بلکہ اُسی زمین میں گل سڑ کر خاک کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔اس کے بدن کی نشو ونما اور آبیاری بھی اِسی مٹی سے ہوئی ہے۔سورۃ طٰہٰ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى(6)

ترجمہ: "اسی زمیں سے ہم نے تمہیں بنایا اور اسی میں لوٹائیں گے اور دوبارہ اِسی سے نکالیں گے۔"

لیکن روح ایک حقیقت ہے۔روح "اصل" ہے قرآن کریم میں اُسے کبھی رُوح اور کبھی نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔پھر یہ محض خیال اور فکر کی حد تک نہیں اِسی روح و بدن نے باقاعدہ نظام ہائے حیات کی ترتیب و تدوین میں اہم کردار ادا کیا۔انسان جتنا بدن کی طرف، بدنی ضروریات اور بدنی خواہشات کی تکمیل کی طرف بڑھتا چلا گیا، روحانیت سے دور ہوتا گیا اور روحانیت سے دوری اور مادیت کے غلبے نے اُسے انسانیت سے دُور کر دیا۔اِسی مادیت نے اُسے نسلی، لسانی اور جغرافیائی تفرقات کا شکار کر دیا۔جنگِ عظیم اول اور دوم میں کروڑوں انسانوں کا لقمہء اجل بن جانا اِسی مادیت کا نتیجہ ہے اور روحانیت کے فقدان سے محبت و اُنس ختم ہو گئی۔ترقی یافتہ یورپ آج مادی ترقی لیکن بقولِ اقبال زندگی کی شبِ تاریک کو سحر کی سپیدی میں تبدیل نہیں کر سکتا۔

؎ ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا(7)

غرض یہ ہے کہ سقراط اور اقبال اِس خیال میں متفق ہیں کہ موت کے فوراً بعد ایک اور زندگی، روحانی طور پر شروع ہو جاتی ہے۔اور روح مختلف مراحل اور مدارج طے کرتی ہے۔اِن مماثلات کے علاوہ اقبال کو سقراط کے فکر میں کسی کمی کا احساس ہوا، تو اُس کی تصحیح کی۔اس طرح اقبال تشکیلِ جدید میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"فلسفہ یونان کی حیثیت تاریخِ اسلام میں ایک زبردست ثقافتی قوت رہی ہے۔لیکن جب ہم علمِ کلام کے اُن مختلف مذاہب پر نظر ڈالتے ہیں جن کا ظہور فلسفہ یونان کے زیرِ اثر ہوا اور اُن کا مقابلہ قرآن پاک سے کرتے ہیں، تو یہ اہم حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ یونانی فلسفے نے مفکرینِ اسلام کے مطمحِ نظر میں اگرچہ بہت کچھ وسعت پیدا کر دی تھی مگر بحیثیتِ مجموعی قرآن مجید میں اُن کی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی۔سقراط کی

توجہ صرف عالمِ انسانی پر رہی۔ اُن کے نزدیک انسان کے مطالعے کا بہترین موضوع انسان ہی ہو سکتا ہے، نہ کہ نباتات اور حشرات یا ستاروں کی دُنیا۔ مگر اِس سے کس قدر مختلف ہیں قرآن پاک کی تعلیمات، جس کا ارشاد ہے کہ شہد کی مکھی ایسی حقیر شے بھی وحی الٰہی سے بہرہ ور ہوئی اور جس نے بار بار اس امر کی دعوت دی کہ ہواؤں سے مسلسل تغیر و تبدل مشاہدہ کیا جائے، نیز دن رات کے اختلاف، تاروں بھرے آسمان اور بادلوں کا جو فضائے لامحدود میں تیرتے پھرتے ہیں۔ سقراط کے شاگردِ رشید افلاطون کو بھی ادراک بالحواس سے نفرت ہی رہی۔ اُس کا خیال تھا ادراک بالحواس سے کوئی حقیقی علم تو حاصل نہیں ہوتا، ہم اِس کی بِنا پر صرف ایک رائے قائم کر سکتے ہیں۔ برعکس اِس کے قرآن مجید نے سمع و بصر کا شمار اللہ تعالیٰ کے گراں قدر انعامات میں کیا اور عند اللہ اپنے اعمال و افعال کا جواب دہ ٹھہرایا۔ یہ حقیقت تھی جسے شروع شروع کے مسلمانوں نے قرآن مجید کے مطالعے میں یونانی ظن و تخمین سے مسحور ہو کر نظر انداز کر دیا۔ بہ الفاظِ دیگر انھوں نے اِس کا مطالعہ بھی فکرِ یونان ہی کی روشنی میں کیا اور پھر کہیں دو سو برس میں جا کر سمجھے اور وہ بھی پورے طور پر نہیں کہ قرآن پاک کی روح اساساً یونانیت کے منافی ہے۔"(8)

غرض سقراط کے افکار کوئی وحی الٰہی نہ تھے بلکہ اُن کی ذہنی اختراعات اور مطالعہ کے ثمرات تھے جو انھوں نے پڑھا تھا ۔چونکہ اُن کے بعض خیالات جن کا ذکر گذشتہ صفحے میں کیا گیا، قرآنی تعلیمات سے اختلاف رکھتے ہیں اِس لیے اقبال نے بزورِ استدلال اُن افکار کو رد کیا۔ اور اس تردید کی وجہ بھی یہی تھی کہ اُن کے خیالات کو افلاطون نے قبول کر کے اور اُن میں اپنے افکار کو ملا کر ایک مسحور کُن فلسفہ پیش کیا پھر یہی فلسفہ مسلمانوں کے اندر بہت سی خرابیوں کی جڑ بن گئی۔

ڈاکٹر اقبال سقراط کی ثابت قدمی کی تعریف کرتے ہیں کہ اُس نے جلاوطن ہونے کی بجائے زہر کا پیالہ قبول کیا۔ سقراط کے ساتھ اُس زمانے کے دیگر یونانی فلاسفہ اور مفکرین کو بُغض پیدا ہوا تھا اور اُس کے خلاف ایسے جھوٹے مقدمات گھڑے جس نے نہ صرف اُسے موت کی سزا ملے بلکہ وہ اخلاقی طور پر بھی لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو جائے۔ لیکن اُن کی موت کے بعد لوگوں کو جب حقیقتِ حال معلوم ہوئی تو اُنھوں نے اُس متعصب اور سازشی ٹولے کو خوب مطعون کیا۔ لیکن یونان ایتھنز ایک عظیم فلسفی سے محروم ہو چکا تھا۔

فلسفے کے میدان میں جس ہستی نے ایک دائمی شہرت حاصل کی، جس کے فلسفے کو لوگ بطورِ ضرب المثل استعمال کرتے رہے، اُس کا نام افلاطون ہے۔ قطعِ نظر اِس سے کہ افلاطون کی کن باتوں سے اتفاق اور کن سے اختلاف کیا جائے، یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ اُس نے اپنے بعد نوعِ انسانی کی ہر نسل اور ہر عہد کو اپنے فلسفیانہ اور حکیمانہ افکار سے متاثر کیا ہے۔ بحیثیت

فلسفی علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا افلاطون کے افکار و تخیلات سے متاثر ہونا یقینی ہے یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے بہت سی باتوں پر تنقید کی ہے اور بہت سی باتوں کو رد بھی کیا ہے۔

افلاطون تصورات کو اصل سمجھتا ہے اور اس کے مقابلے میں مادیت اور ساری کائنات محض ایک فریب اور واہمہ ہے ۔اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں موجود مختلف اشیاء تغیر پذیر ہیں،اِس لیے یہ تغیر پزیری حقیقت کے معیار پر پورا نہیں اُتر سکتی ،اس تصور نے گویا تصوف کی بنیاد رکھی۔یہی وجہ ہے کہ اقبال کے خیال میں تصوف کے لیے افلاطون ایک روحانی چشمہ تھا۔یہی روحانی چشمہ جب اہلِ اسلام سے متعارف ہوا تو شیخ اکبر ابن عربی نے ان روحانی تعلیمات کو قرآنی فکر سے ہم آہنگ کر کے وحدت الوجود کو بلندی آسماں تک پہنچا دیا۔پھر سلسلہ چل نکلا اور ایک کے ایک اِس فلسفے سے متاثر ہو کر بالواسطہ فکرِ افلاطون کو اسلامی تعلیمات کا ملمع لگا کر پھیلاتا رہا۔اُن کی خلوصِ نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا لیکن نادانستہ طور پر افلاطونیت کی پرچار جاری رہا۔اس لیے علامہ اقبال نے افلاطون کے ساتھ ساتھ حافظ شیرازی اور ابن عربی پر بھی تنقید کی اور اپنے اشعار میں فرمایا کہ اُن کا پیالہ زہر سے لبریز ہے۔

علامہ اقبال نے پوری کوشش کی کہ تصوف میں افلاطونیت کی جو آمیزش ہوئی ہے اُسے دور کرنے کی کوشش و سعی کی جائے۔اقبال افلاطون کی مخالفت اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ افلاطونی فکر اہلِ اسلام کو قرآنی تعلیمات سے دور لے جانے پر مجبور کرتی ہے۔علامہ اقبال ہر اُس فلسفی اور شاعر و ادیب کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتے جو اللہ تعالیٰ کے شخصی تصور کا قائل نہیں۔وجودی فلسفے کے زیرِ اثر اللہ تعالیٰ کی ذات کو پورے عالم میں پھیلا نور سمجھتے ہیں۔

قسمت کا تصور،افلاطون کے فلسفے کی وجہ سے اسلامی معاشرت پر اِس قدر اثر انداز ہوا کہ بعض مفکرین نے اِسے اسلام کی روح سمجھنا شروع کر دیا۔اس کے بعد تقریباً سبھی صوفی شعراء اور خصوصاً حافظ شیرازی نے پوری طرح اِس کی پرچار کی اور تصورِ قسمت کو فلسفہ خیر و شر کے ساتھ ملا دیا۔چنانچہ اُمت کے اندر بے عملی نے راہ پالی۔حکیم الامت نے اِس شے کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔اور پھر اپنے حکیمانہ و مصلحانہ اندازِ فکر قسمت کے اِس غلط تصور کر مسترد کر دیا۔وحدت الوجودی نظریے کو اقبال نے ابتداء میں قبول کیا تھا اور اُن کے ابتدائی کلام میں اِن تصورات کا پرتو ملتا ہے لیکن بعد میں وسیع مطالعے کے نتیجے میں اِس خیال سے منحرف ہو گئے تھے۔افلاطون کا مذہبی تصور بھی وحدت الوجود ہی تھا۔

علامہ اقبال،افلاطون کے فلسفہ ریاست کے کسی حد تک حامی ہیں اور اُسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے نظریے میں ریاستی معاملات اور اخلاقیات میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔افلاطون کی تصنیف "الجمہور" اہلِ عالم

کے لیے بالخصوص ادبا کے لیے ایک مشعلِ راہ کی حیثیت اختیار کر گئی اور اقبال کی نظم "رموزِ بے خودی" پر بعض مفکرین کے خیال میں "الجمہور" کا اثر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اقبال نے اُسے قرآنی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالا اور اُسے اہلِ اسلام کے لیے اسلامی آئین کی تعمیر کے لیے ایک مینارہء نور بنایا۔ افلاطون کی تعلیمات میں ریاست کو اخلاقیات کے دائرے میں رہنا چاہیے۔ اقبال کی فکری اساس چونکہ قرآن کریم ہے اس لیے وہ افلاطون کے فکری نکات کی اُن جگہوں پر مخالفت کرتے نظر آتے ہیں جہاں افلاطون کے افکار قرآنی تعلیمات سے مختلف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ خطباتِ اقبال کے پہلے خطبے میں فرماتے ہیں:

> "ہم سب جانتے ہیں کہ یونانی فلسفہ اسلامی تاریخ میں ایک عظیم کلچرل طاقت رہی ہے لیکن اگر قرآن مجید اور فقہ کے مختلف مکاتب کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جو فلسفہ یونانی فلسفہ کے زیر اثر ظہور پذیر ہوا اگرچہ اُس نے اسلامی فلسفیوں کے اذہان کو کشادگی بخشی لیکن مسلمانوں کے لیے اِس فلسفے نے قرآن مجید کے تصور کو دُھندلا دیا۔"(9)

اقبال کا افلاطون سے اختلاف خودی کی وجہ سے تھا۔ اقبال خودی کے ارتقائی سفر کو طے کر کے بے خودی کی طرف بڑھتا ہے۔ یعنی روحانی قوت کے ساتھ ساتھ اصلاحِ معاشرت اُن کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ اقبال اور افلاطون دونوں انسانی معاشروں کی ترقی، استحکام اور خوشحالی چاہتے ہیں۔ لیکن افلاطون اصلاح کا کام خودی کو چھوڑ کر براہِ راست بے خودی سے شروع کرنا چاہتے ہیں جب کہ اقبال اِس طریقہ کار کو غلط سمجھتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اگرچہ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ افلاطون نے سیاسیات کے ساتھ اخلاقیات اور فلسفے کا امتزاج بھی کیا ہے۔ دونوں حضرات فردِ ملت کے فلسفے کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے ، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں(10)

علامہ اقبال کی "رموزِ بے خودی" اور افلاطون کی "الجمہوریہ" میں سیاسیات اور اخلاقیات کو جو یگانگت نظر آتی ہے اُس کے متعلق اقبال فرماتے ہیں:

> "ظاہر ہے کہ اگر مذہب کا تصور یہی ہے کہ اِس کا تعلق صرف آخرت سے ہے انسان کی دنیوی زندگی سے کوئی سروکار نہیں تو جو انقلاب مسیحی دُنیا میں رونما ہوا ہے وہ ایک امر طبعی ہے۔ مسیح علیہ السلام کا عالمگیر نظامِ اخلاق نیست و نابود ہو چکا ہے اور اُس کی جگہ اخلاقیات اور سیاسیات کی قومی نظامات نے لے لی ہے اِس سے اہلِ مغرب اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے اُسے دُنیوی زندگی سے

کوئی تعلق نہیں لیکن اسلام کے نزدیک ذاتِ انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے وہ مادے اور روح کی کسی نا قابلِ اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔"(11)

اقبال بہادری اور شجاعت کے ساتھ ساتھ رواداری و برداشت کو نہایت اہم سمجھتے ہیں۔ رسولِ کریمؐ نے فتحِ مکہ کے موقع پر رواداری کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کیں۔ مواخاۃ کے ذریعے جو بھائی چارہ قائم فرمایا پوری تاریخِ انسانی اُس کی نظیر لانے سے قاصر ہے۔

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

عدل و انصاف جو کسی بھی کامیاب ریاست کو چلانے کے لیے از حد ضروری ہے۔ یہی عدل، ایک انسان یا مختلف انسانوں میں ہو، اس کے متعلق افلاطون اپنی کتاب ریاست میں لکھتا ہے:

"یہ تو ظاہر ہو چکا ہے کہ عادل شخص ظالم کے مقابلے میں بہتر، عاقل تر اور قوی تر ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ ظالم اور غیر منصف لوگوں میں مشترک کی قوت مفقود ہو جاتی ہے بلکہ میرے نزدیک تو یہ بھی ممکن نہیں کہ کچھ بد لوگ مل کر متحدہ کوئی بُرائی کریں۔ کیوں کہ اگر وہ اپنی بدی میں کامل ہوتے تو آپس میں ایک دوسرے پر ہاتھ صاف کرنے لگتے۔ یہ تو شاید ان میں کوئی عدل کا شائبہ باقی تھا جس نے انھیں متحد کر دیا اور حقیقتاً وہ اپنی کاروائی میں نیم بد تھے۔ بے ایمانی میں ہونے کے ساتھ ہی وہ عمل کے قابل نہ رہتے۔ میرے خیال میں یہی حقیقتِ امر ہے۔ ہاں یہ البتہ دوسرا سوال ہے کہ غیر منصف و ظالم کی بہ نسبت ایک عادل شخص کی زندگی بہتر اور خوشتر ہوتی ہے یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وجود مذکورہ بال سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ عادل شخص ہی کی زندگی خوشتر ہوتی ہے لیکن پھر بھی اس کی مزید تحقیق ضروری ہے کہ مسئلہ زیرِ غور کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ تو انسانی زندگی کا دستور العمل ہے۔"(12)

علامہ اقبال اور افلاطون دونوں محض آلاتِ فن جمع کرنے کے حق میں نہیں جب تک کہ اُن کو چلانے کا فن اور حوصلہ موجود نہ ہو۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

امارت کیا ، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں ، نہ استغنائے سلمانی(13)

اور افلاطون اپنی تصنیف میں اس شے کو نہایت سہل اور عمدہ امثال سے سمجھاتا ہے:

"یوں تفریح ہی تفریح میں تو آدمی تاش اور شطرنج تک کا ماہر نہیں بن سکتا۔ مہارت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اوائل عمر ہی سے ایک کام میں مشغول رہے اور کسی دوسری طرف توجہ نہ کرے۔ جس طرح خالی اوزار آدمی کو اہل حرفہ نہیں بنا سکتے اسی طرح صرف ہتھیاروں سے آدمی مدافعت کے قابل نہیں ہو جاتا جب تک اچھی طرح ان کا استعمال کرنا نہ جانتا ہو محض آلاتِ حرب سے مسلح ہو کر اور ہاتھ میں ایک سپہر لے کر ایک ہی دن میں آدمی جنگجو سپاہی تو بن نہیں سکتا۔"(14)

افلاطون اور اقبال کے درمیان اختلاف اُس وقت پیدا ہو جاتا ہے جب افلاطون حرکت و عمل کی بجائے سکون اور بے عملی کا درس دیتے ہیں۔ اس سے متاثر ہو کر بعض مسلمانوں نے قرآن کی تعبیر و تفسیر بھی یونانی فلسفے اور فلسفہ افلاطون وارسطو کے ذریعے کرانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ڈاکٹر اقبال نے تشکیلِ جدید میں اُن پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابنِ خلدون نے کس طرح اِس طلسماتی اور بظاہر دلفریب نظر آنے والے فلسفے کو شکستِ فاش دی۔

اقبال افلاطون کے اِس فلسفے کی مخالفت کرتے ہیں کہ افلاطون نے اپنی اکادمی پر لکھا تھا کہ جسے ریاضی، جیومیٹری نہیں آتی اُس کا داخلہ ممنوع ہے۔ اقبال اگر کوئی یونیورسٹی بناتا تو اُس کے اوپر لکھ دیتے کہ اس کو یونیورسٹی کے نصاب سے نکال دیا جائے ۔اس کے علاوہ موسیقی چونکہ انسانی خودی میں کمزوری و دلگیری پیدا کرتی ہے اس لیے اقبال، افلاطون کے برعکس اِس کی مخالفت کرتے ہیں۔

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات(15)

اقبال عقل وزیر کو عشق کے شانہ بشانہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ افلاطون کی طرح انتہاؤں کی طرف نہیں جاتے۔ بلکہ عشق کو عقل وزیر کی پر ایک گونہ غلبہ حاصل ہے۔ کیونکہ عقلیت، عافیت کوشی کی متلاشی ہوتی ہے اور کارگاہِ حیات کی رزم گاہوں میں جانے کتراتی ہے۔ جب کہ فتح کے لیے ان باطل قوتوں سے نبرد آزما ہونا ناگزیر ہے۔

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبریل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول(16)

افلاطون عدل کو تمام خوبیوں کا منبع قرار دیتے ہیں جب کہ اقبال اُس کے مقابلے میں فقر کو سرچشمہ حسنہ قرار دیتے ہیں ۔فقر کا مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات کی تسخیر کرنے کی قوت اُس کے اندر موجود ہے لیکن اِس سے مستغنی ہو، کچھ لوگوں نے فقر کو غُربت، مفلسی اور تنگ دستی سے تعبیر کر کے اُسے مستحسن قرار دیا لیکن اقبال نے ایسے فقر سے اجتناب کا درس دیا ہے۔ اُس

کی بجائے فقرِ غیور ہی اُن کا دعوی رہا کہ یہ فرنگی مادیت اور عجمی فلسفہ رہبانیت و تصوف کا حریف ہے۔ کمال یہ نہیں کہ آپ رنگینی سے دور رہیں بلکہ کمال یہ ہے کہ آپ آب و رنگ کے ہوتے ہوئے اُس سے بے نیاز رہیں۔

ارسطو کے فلسفے سے بڑے بڑے مسلمان اہلِ علم بھی متاثر ہوئے۔ خصوصاً سیاسیات کے حوالے سے اُن کے افکار سے اہلِ عالم نے بہت استفادہ کیا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے سقراط کے افکار و نظریات کا بخوبی مطالعہ کیا اور اُن کی بعض باتوں کو اپنے بنیادی فکر سے ہم آہنگ دیکھا اُس کو قبول کیا اور جن افکار کو اپنے افکار کے مخالف محسوس کی، ترک کیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبد اللہ فرماتے ہیں:

> "اقبال نے افلاطون کے فکر پر معترضانہ تنقید کی ہے اور اسے ایک جگہ "راہبِ اوّل" اور ایک دوسرے موقعے پر "گوسفندِ قدیم" کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افلاطون اس کائنات کو محض عکس کہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مثالی دُنیا کہیں اوپر ہے۔ اعیانِ ثابتہ وہیں ہیں۔ یہ دُنیا محض سایہ ہے۔ اقبال اس تعلیم کو حقائقِ زندگی کے نقطۂ نظر سے غلط سمجھتے تھے۔ افلاطون کا نقطۂ نظر عقلی تھا (اگرچہ اخلاقی بھی تھا)، اس معاملے میں اقبال کے نزدیک ارسطو کی رائے وقیع تھی کیونکہ وہ اس مادّی دُنیا کو بھی حقیقت جانتا تھا، ارسطو کا طریقِ کار زیادہ سائنسی تھا اور سائنسی انکشاف (scientific discovery) کی تحریک اسی کے زیرِ اثر وجود میں آئی۔ ان وجوہ سے اقبال ارسطو کی تائید کرتے ہیں۔"(17)

یونانی فلاسفہ بشمول ارسطو ڈراموں کے ذریعے مختلف مسائلِ حیات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اہلِ اسلام نے یونانی فلسفے سے بہت کچھ استفادہ کیا لیکن اِس شے کو قبول نہ کیا۔ اقبال چونکہ اسلام کی طرف سے صف آراء ہیں اس لیے وہ بھی ڈرامے کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبد اللہ نے درج ذیل وضاحت کی ہے۔

> "مسلمانوں نے یونانیوں سے بہت کچھ لیا لیکن ڈراما نہیں لیا۔ اس کا بڑا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک فرضی یا "مستعار (vacations)" صورتِ حال کے بہروپ کو سنجیدگی (seriousness) کے خلاف سمجھتا ہے۔ اقبال کو اصرار ہے کہ کوئی ایک فرد کسی دوسرے فرد کی خودی کو اپنا نہیں سکتا۔ غیر کا حال بیان تو کیا جاسکتا ہے اور اس کے نفس کے بارے میں قیافہ بھی ممکن ہے مگر کسی غیر کے نفس کا مثنیٰ بن جانا غیر حقیقی اور غیر معقول اَمر ہے۔ ارسطو نے المیے کو اہمیت دے کر، اسے تزکیۂ نفس کا ذریعہ قرار دیا تھا مگر ارسطو کے بہت سے شارحین نے المیے کو تزکیۂ نفس (catharsis) کا وسیلہ ماننے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، ہزاروں لاکھوں انسان ہر روز المیے کو سٹیج پر دیکھتے ہیں مگر ان میں سے شاید ایک بھی اتنا متاثر نہیں ہوتا کہ بدی کو چھوڑ کر نیکیاں شروع کر دے۔ اس طرح گویا ارسطو کی قائم کردہ اس بنیاد کی کہ ڈراما نفس انسانی کی

اصلاح کر سکتا ہے، تردید ہو چکی ہے، ان معنوں میں اگر اقبال نے بھی تمثیل کو حقیقی اور نتیجہ خیز عمل تسلیم نہیں کیا تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔"(18)

اسلام ایک ایسا دین نہیں جو محض عقل، تصور، یا تفکر کی دعوت دیتا ہے بلکہ عقل کے ساتھ ساتھ وجدان سے کام لینے کی طرف بھی بلاتا ہے۔ محض فکر و خیال سے کچھ نہیں بنتا بلکہ عمل اور جدوجہد اور ٹھوس حقائق پر بھی زور دیتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کے شانہ بشانہ تفکر و تدبر، تعقل اور مراقبے وغیرہ کو دیکھنا چاہتے ہیں اسلام نے ہی سائنسی ترقی کا رستہ دکھلایا ہے۔ اسلام کی آدرش لامتناہی ہے اور اِس لامتناہی و لامحدود شے کی تلاش میں اسلام نے تمام سائنسی میدانوں کو ترقی کی جانب بڑھایا۔ اقبال چونکہ حرکت و عمل کو پسند کرنے والے تھے۔ اُن کا نظریہ حرکی تھا، اس لیے جمود اُسے سخت ناپسند تھی اور اپنے متحرک نظریات کے مقابلے میں اقبال نے ہر اُس نظریے کو رد کر دیا جو جمود تھا یا جمود کی دعوت دینے والا تھا۔

ارسطو اور اُس کے پیروکار اس کائنات کو ازلی و ابدی سمجھتے تھے اور اُس میں کسی قسم کی تبدیلی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ جب کہ اقبال نے فرمایا:

؎ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون(19)

اقبال نے روح کو مادیت پر ترجیح دی ہے۔ مادیت کی علمبرداری عقل کے ہاتھوں میں ہے اور روحانیت کا مہار عشق کے پاس ہے ۔ عشق میں اخلاص، قربانی اور ایثار ہے جب کہ عقل کے پاس خود غرضی، دکھاوا، لالچ اور ذاتی مفادات ہیں۔ اس لیے اقبال فرماتے ہیں:

ترا تن روح سے ناآشنا ہے
عجب کیا! آہ تیری نا رسا ہے
تن بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے(20)

علامہ مرحوم کو فلسفہ قدیم و جدید کا مطالعہ اس قدر تھا کہ اُن کا حق بنتا تھا کہ وہ فلاسفہ اور اُن کے افکار پر تنقید کریں۔ فلسفے کے متعلق اُن کے کلام اور افکار کا مطالعہ کرنے سے انھیں متکلم کہا گیا۔ چنانچہ اِس عظیم متکلم کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ارسطو جیسے لوگوں سے اختلاف کر سکے یا اُن پر تنقید کریں۔

سید ظفر الحسن نے ۱۹۲۹ء میں اقبال کے حوالے سے جو خطبہ دیا تھا۔ڈاکٹر محمد سہیل عمر صاحب نے پورے اہتمام اور صحت کے ساتھ اُس کا ترجمہ کیا ہے:

> "ڈاکٹر اقبال کو اسلام اور جدید فلسفہ و سائنس کے اصولوں کی جو گہری بصیرت حاصل ہے اُن کے مالہ وماعلیہ کے بارے میں اُنہیں جیسی تازہ ترین اور وسیع معلومات حاصل ہیں، ایک جدید نظامِ فکر تعمیر کرنے کی جیسی مہارت اور استعداد اُنہیں میسر ہے بالفاظِ دیگر فلسفے اور اسلام کو ہم آہنگ کرنے اور تطبیق دینے کی جیسی بے مثل لیاقت اُن میں پائی جاتی ہے اس نے اُن کو آمادہ کیا کہ وہ اُس کام کو دوبارہ انجام دیں جو صدیوں پہلے یونانی فلسفہ و سائنس کے روبرو ہمارے علما، مثلاً نظام اور (ابوالحسن) اشعری نے اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ اپنے ان خطبات میں انہوں نے ہمارے لیے ایک جدید علم کلام کی نیو رکھ دی ہے۔ حضرات یہ کام صرف وہی انجام دے سکتے تھے۔"(21)

شاعرِ مشرق علامہ اقبال اور ارسطو میں ایک اور یک جہتی ء فکر، آزادی کے حوالے سے ہے۔اقبال کے فلسفہ خودی کی تکمیل اور استحکام کے لیے حُریتِ فکر، لازمی خیال کرتے ہیں۔ارسطو بھی آزادی کا حامی ہے لیکن وہ مطلق آزادی کو پسند نہیں کرتے کیونکہ بعض اوقات مطلق آزادی سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔اگر ہم دیکھیں تو مغربی ممالک، جنھیں جمہوریت اور آزادی فکر پر بڑا ناز ہے، اِس فکری بے اعتدالی کا شکار ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کئی اہلِ علم و دانش نے اِس حوالے سے سوالات اُٹھائے کہ کہیں جمہوری نظام میں بذاتِ خود کوئی غلطی تو نہیں ہے۔اِس کے علاوہ آزادی کے حوالے سے وہ سیاسی آزادی کو ہی مد نظر رکھتے ہیں۔معاشی دباؤ کے خاتمے اور اِس حوالے سے آزادی اور حُریت ان کی نظر میں نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر اقبال، ارسطو کے اِس اندازِ تدریس سے متاثر ہوئے اور امتِ مرحومہ کے مردہ جسم میں حیاتِ تازہ کی پھونکیں مارنے لگے۔لیکن اقبال کے پاس ارسطو کے مقابلے میں ایک اعلیٰ ترین فکرِ حیات موجود تھا۔اُن کے پاس انسانِ کامل بنانے کے گر موجود تھے۔ارسطو کا فاتح تو ہر شے کو تاراج کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور پھر کچھ عرصے کے بعد یہ سب کچھ ایک گزری ہوئی تاریخ کا حصہ بن گیا۔لیکن اقبال کے مردِ کامل نے جہاں کچھ وقت بھی گزارا، وہاں اپنی نشانیاں، اعلیٰ کردار و اخلاق کے عمدہ نمونے چھوڑے۔

افلاطون کی کئی باتوں میں مخالفت کی وجہ سے اقبال ارسطو سے کافی متاثر ہوئے۔جس کا انھوں نے اپنی کتاب(stray reflection) میں ذکر کیا ہے۔اقبال لکھتے ہیں:

"میں ارسطو سے نہایت عقیدت رکھتا ہوں صرف اس لیے نہیں کہ میں (بیسویں صدی کا باشندہ) سے اپنی نسل کے اسلاف سے زیادہ بہتر طور پر جانتا ہوں بلکہ اس لیے بھی کہ اُس نے میری قوم کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا ہے تاہم افلاطون کے نظریہ اعیان پر اس کی تنقید میں جو ہلکی سی ناشکری نظر آتی ہے، وہ مجھے اس کی مکمل مدح سے روک دیتی ہے۔ میں سچائی پر مشتمل اُس کی اپنے استاد کے نظریات کی تکذیب کا انکار نہیں کرتا مگر مجھے سخت نفرت ہے اس انداز سے، جس سے وہ اِن کو پیش کرتا ہے۔" (22)

اِس پورے جائزے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے پیش روؤں کی گزر گاہوں کو شاہراہوں میں بدل دیا۔ سقراط اور افلاطون کے فلسفوں کے علاوہ ارسطو نے نے اپنی انقلابی سوچ سے اقبال کو متاثر کیا۔ اُس نے سکندر اعظم کی شکل میں ایک باصلاحیت نوجوان کو ملک گیری پر اس طرح مائل کیا کہ اُس نے چند ہی سالوں میں دُنیا کے ایک بڑے حصے کو اپنے زیرِ نگیں بنالیا ۔ قطعِ نظر کہ اُس نے ایک ظالمانہ نظام برپا کیا تھا یا منصفانہ نظام۔ علامہ مرحوم ہر مردِ مومن کے اندر ایک ایسے فاتح کی خصوصیات کا متمنی ہے لیکن اُس کا مطمحِ نظر سکندرِ اعظم نہ تھا، محمد رسول اللہ ﷺ، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ایسی ہستیاں درکار تھیں۔ الغرض اقبال نے سقراط، افلاطون اور ارسطو کا اثر قبول کیا اور یہ فکرِ اقبال میں ایک مصدر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خلاصہ کلام:

یونان کو فلسفے کی جنم بھومی کہا جاتا ہے اور جتنے بھی فلسفی گزرے ہیں، ان میں سے تقریباً سبھی یونانی فلسفے سے متاثر رہے۔ علامہ اقبال کا شمار دنیا کے چند عظیم فلاسفہ میں ہوتا ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ علامہ اقبال نے اگرچہ بہت سی فلسفیانہ افکار میں یونانی فلاسفہ سے اکتسابِ فیض کیا ہے، لیکن وہ تقلیدِ جامد یا مرعوبیت کا شکار نہیں رہے، بلکہ اہلِ یونان کی بہت سی غلط افکار اور تسامحات کی تصحیح کرتے رہے اور یوں علامہ مرحوم نے عالم اسلام کے ساتھ ساتھ عالم انسانیت کی ایک بڑی علمی خدمت انجام دی ہے۔

حوالہ جات

1. اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، اشاعت مارچ ۲۰۱۵ء، ص ۲۸۲۔
2. افلاطون، مکالمات افلاطون، مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، اشاعت ۱۹۴۲ء، ص ۸۸، ۸۷۔
3. محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، ص ۳۰۲۔

4. افلاطون، مکالمات افلاطون، مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، اشاعت ۱۹۴۲ء ص ۳۳۳، ۳۲۳۔
5. ول ڈیورنیٹ، داستان فلسفہ، مترجم سید عابد علی عابد، فکشن ہاؤس ۱۸۔ مزنگ روڈ لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۵۔
6. القرآن الکریم، سورۃ طٰہٰ، ۲۰:۵۵۔
7. محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، ص ۵۸۳۔
8. نذیر نیازی، سیّد (مترجم)، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، بزمِ اقبال، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۴۰، ۳۹۔
9. علامہ اقبال تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ سیّد نذیر نیازی، (مترجم) بزمِ اقبال، کلب روڈ لاہور، ص ۳۹۔
10. محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، ص ۲۱۷۔
11. علامہ اقبال تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ سیّد نذیر نیازی، (مترجم) بزمِ اقبال، کلب روڈ لاہور، ص ۴۱۔
12. افلاطون، ریاست، مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین، جامعہ ملیہ برقی پریس دہلی، ۱۹۳۲ء، ص ۶۲، ۶۱۔
13. محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، ص ۴۴۷۔
14. افلاطون، ریاست، مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین، جامعہ ملیہ برقی پریس دہلی، ۱۹۳۲ء، ص ۱۰۳۔
15. محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، ص ۵۹۱۔
16. ایضاً، ص ۵۸۶۔
17. اقبال: مسائل ومباحث، علامہ اقبال کے فکر و فن پر ڈاکٹر سید عبد اللہ کے مقالات مرتب: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال اکادمی پاکستان، ص ۲۲۳۔
18. اقبال: مسائل ومباحث، علامہ اقبال کے فکر و فن پر ڈاکٹر سید عبد اللہ کے مقالات مرتب: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال اکادمی پاکستان، ص ۳۰۶۔
19. محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، ص ۳۶۴۔
20. محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، ص ۴۱۵۔
21. محمد سہیل عمر، خطباتِ اقبال نئے تناظر میں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع دوم ۲۰۰۲ء، ص ۱۷۷۔
22. محمد اقبال منتشر خیالاتِ اقبال، مرتبہ از ڈاکٹر جاوید اقبال، ترجمہ میاں ساجد علی، زاہد بشیر پرنٹرز لاہور، اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۶۱۔

References:

1. Iqbal , allama, kuliyat Iqbal , national buk فاؤنديشن Islamabad, ashaat March p. 282, 2015
2. Aflatoon, Mukalimat aflatoon, mutrajim dr syed abid Hussain, anjuman

taraqqi urdu (hind) Dehli p.87, 88, Ed.1942

3. Allama, Muhammad Iqbal, kuliyat Iqbal p. 302
4. Aflatoon, Mukalimat aflatoon, mutrajim dr syed abid Hussain, anjuman taraqqi urdu (hind) Dehli p.323, 333
5. Val Duvenet Daastaa'n falsafah, mutrajim syed abid Ali abid, fiction house18, mzng road Lahore, 1995, p45
6. Al Quran Alkrim, surah taah, 55/20
7. Allama, Muhammad Iqbal, kuliyat Iqbal p. 583
8. Nazeer nayazi, siid (mutrajim), tashkeel jadeed الہیات islamia, bzmِ Iqbal , Lahore , 2012, p 39-40
9. Allama Iqbal tashkeel jadeed Ilaahiyat islamia Syed Nazeer Nayazi, (mutrajim) bzmِ Iqbal , club road Lahore, p 39
10. Allama, Muhammad Iqbal, kuliyat Iqbal p. 217
11. allama Iqbal tashkeel jadeed الہیات islamia siid Nazeer nayazi, (mutrajim) bzmِ Iqbal , club road Lahore , p. 41
12. Aflatoon, riyasat, mutrajim dr zakr Hussain , jamea maliya barqi press Dehli ,1932, p. 61-62
13. Muhammad Iqbal, allama, kuliyat Iqbal , p.667
14. Aflatoon, riyasat, mutrajim dr zakr Hussain , jamea maliya barqi press Dehli ,1932, p.103
15. Muhammad Iqbal, Allama, kuliyat Iqbal , p.591
16. Ibid p.586
17. Iqbal: Masail wa mubahais, allama Iqbal ke fikar o fun par dr syed Abdul االله ke maqalat muratab : dr Rafi Aldeen hashmi, Iqbal akadmi Pakistan , p.223
18. Ibid, p.306
19. Muhammad Iqbal, Allama, kuliyat Iqbal , p. 364
20. Muhammad Iqbal, allama, kuliyat Iqbal , p.415
21. Mohammad Sohail Umar , khutbaat glandorf Iqbal naye tanazur mein, Iqbal akadmi Pakistan , Lahore , taba dowm, ed. 2002, p177
22. Mohammad Iqbal muntashir khayalat Iqbal , martaba az dr Javed aqba l-, tarjuma miyan Sajid Ali , Zahid Basheer printers Lahore , ed.2016, p.16